یونیورسٹی کلچر اور نوجوانوں کی ہمہ جہتی شخصیت سازی کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مطالعہ

A Study of University Culture and the All-Round Personality Development of Youth in the Light of Islamic Teachings

Muhammad Sajid Zikria
MPhil Scholar,
Department of Islamic Studies, Superior University, Lahore
Email: zakriasajid584@gmail.com
Dr Hafiz M Mudassar Shafique (Corresponding Author)
Assistant Professor,
Chaudhry Abdul Khaliq Center for Contemporary Islamic Sciences (CAKCCIS),
Superior University, Lahore
Email: mudassaraarbi@gmail.com

Abstract
In the present era, universities are not only centers of knowledge and research, but also play a fundamental role in shaping the intellectual, moral, social and leadership skills of the youth. University culture has a profound impact on the ideas, attitudes, values and lifestyle of students. If this environment is based on positive, moral and academic values, then the youth become balanced, moral and responsible citizens and play an effective role in the development of society, while an educational environment based on negative trends can cause intellectual chaos in the personality, moral weakness and social misbehavior. In this context, Islamic teachings provide a comprehensive and balanced guidance for the all-round personality development of the youth.
The aim of this study is to analyze the effects of university culture on the intellectual, spiritual, moral, social and leadership personality of the youth in the light of Islamic teachings and to present an educational and training model that can promote positive character development in universities. The research will adopt an analytical and descriptive study of the Holy Quran, the Sunnah of the Prophet ﷺ, the biography of the Blessed Prophet, classical and contemporary Islamic sources and relevant academic literature. It will also examine the educational and social environment of modern universities and the intellectual and moral challenges faced by students.
The research expects that a university culture based on Islamic teachings can play an important role in promoting qualities such as honesty, responsibility, moderation, tolerance, academic integrity, critical and creative thinking, mutual respect, social service and effective

leadership among students. Furthermore, the research will provide practical recommendations for university administrators, teachers, curriculum developers and policy-making bodies to create an educational environment that plays an effective role in the all-round personality development of the youth as well as in national development and moral stability.

Keywords: University culture, personality development, youth, Islamic teachings

موجودہ دور میں یونیورسٹی محض اعلیٰ تعلیم فراہم کرنے والا ادارہ نہیں رہی بلکہ یہ ایک ایسا جامع علمی، فکری، سماجی اور تہذیبی نظام بن چکی ہے جو نوجوان نسل کی شخصیت، طرزِ فکر، اخلاقی رویّوں، سماجی تعلقات، پیشہ ورانہ رجحانات اور قیادتی صلاحیتوں کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ جدید جامعات میں طالب علم صرف نصابی معلومات حاصل نہیں کرتا بلکہ وہ ایک ایسے ماحول کا حصہ بنتا ہے جہاں مختلف افکار، تہذیبیں، ثقافتی رجحانات، سماجی رویّے، تحقیقی سرگرمیاں اور عملی تجربات اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو مسلسل متاثر کرتے ہیں۔ اسی بنا پر معاصر فلسفۂ تعلیم میں یونیورسٹی کو شخصیت سازی کا ایک مؤثر سماجی ادارہ قرار دیا جاتا ہے، جہاں تعلیم کا مقصد صرف علمی مہارت پیدا کرنا نہیں بلکہ ایسے متوازن انسان کی تشکیل بھی ہے جو فکری بصیرت، اخلاقی استحکام، سماجی ذمہ داری، تخلیقی صلاحیت اور قائدانہ کردار کا حامل ہو۔ پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی کمیشن نے بھی اپنی متعدد پالیسی دستاویزات میں اس امر پر زور دیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے اداروں کی ذمہ داری صرف تدریس اور تحقیق تک محدود نہیں بلکہ انہیں ایسے گریجویٹس تیار کرنے چاہییں جو تنقیدی فکر، اخلاقی ذمہ داری، سماجی خدمت، اختراع اور قومی ترقی میں مؤثر کردار ادا کر سکیں۔ اسی تصور کی تائید بین الاقوامی تعلیمی ادارے بھی کرتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم، سائنس و ثقافت UNESCO کے مطابق اکیسویں صدی کی اعلیٰ تعلیم کا بنیادی مقصد ایسے افراد کی تیاری ہے جو صرف معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے قابل نہ ہوں بلکہ عالمی شہریت، انسانی وقار، امن، اخلاقی ذمہ داری اور پائیدار ترقی کے فروغ میں بھی فعال کردار ادا کریں۔ اس تناظر میں یونیورسٹی کلچر کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے، کیونکہ تعلیمی ادارے ہی وہ ماحول فراہم کرتے ہیں جہاں نوجوان علمی مہارت کے ساتھ سماجی شعور اور اخلاقی احساس بھی حاصل کرتا ہے۔

"Higher Education Should Foster Responsible Citizenship, Ethical Awareness, Social Cohesion And Sustainable Development Alongside Academic Excellence."[1]

موجودہ تعلیمی نظریات کے مطابق اعلیٰ تعلیم کا مقصد صرف معلومات کی فراہمی یا پیشہ ورانہ مہارت پیدا کرنا نہیں بلکہ نوجوانوں کی فکری، اخلاقی، سماجی اور قیادتی صلاحیتوں کی متوازن نشوونما بھی ہے۔ یونیورسٹی کلچر طلبہ کی شخصیت سازی میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے، کیونکہ یہی وہ ماحول ہے جہاں ان کی علمی استعداد، سماجی رویّے، تنقیدی فکر، تحقیقی رجحانات اور عملی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ اگر جامعات اپنی توجہ صرف تعلیمی مسابقت، ملازمت کے حصول اور معاشی کامیابی تک محدود رکھیں اور کردار سازی، تحقیقی دیانت، سماجی ذمہ داری اور اخلاقی تربیت کو نظر انداز کر دیں تو تعلیمی عمل اپنی جامع افادیت کھو دیتا ہے۔ اس لیے ایک متوازن جامعاتی نظام وہی ہے جو علمی مہارت کے ساتھ اخلاقی استحکام، سماجی شعور، ذمہ دارانہ قیادت اور خدمتِ انسانیت جیسے اوصاف کو بھی فروغ دے، تاکہ نوجوان نسل علمی برتری کے ساتھ قومی اور معاشرتی ترقی میں بھی مؤثر کردار ادا کر سکے۔

4.3.1 فکری نشوونما پر یونیورسٹی ماحول کے اثرات

فکری نشوونما انسانی شخصیت کی تعمیر کا ایک بنیادی اور مسلسل ارتقائی عمل ہے جس کے ذریعے انسان کے ذہن، شعور، ادراک، استدلال، تجزیاتی صلاحیت، تنقیدی بصیرت اور فیصلہ سازی کی قوت میں تدریجی پختگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عمل صرف معلومات کے حصول تک محدود نہیں بلکہ انسان کے اندر ایسے فکری، اخلاقی اور عملی اوصاف پیدا کرتا ہے جو اسے حقیقت کو سمجھنے، مسائل کا تجزیہ کرنے اور دانشمندانہ فیصلے کرنے کے قابل بناتے ہیں ۔ جامعات میں طلبہ مختلف نظریات، تحقیقی مکاتبِ فکر، سائنسی دریافتوں، سماجی علوم، فلسفیانہ مباحث اور بین الاقوامی علمی رجحانات سے متعارف ہوتے ہیں۔ یہ تنوع ان کے ذہن کو وسعت دیتا ہے اور انہیں مختلف آراء کا تقابلی جائزہ لینے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔ یونیورسٹی کا ماحول طلبہ میں تحقیق، خود اعتمادی، آزادانہ سوچ، علمی دیانت اور مسلسل سیکھنے کے جذبے کو فروغ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ممتاز جامعات تحقیق، تنقیدی فکر اور اختراعی صلاحیتوں کو اپنی تعلیمی حکمت عملی کا بنیادی حصہ بناتی ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بھی فکری نشوونما کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام عقل، تدبر، مشاہدہ اور تحقیق کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، تاہم اس کے ساتھ علم کو اخلاق، ایمان اور انسانی ذمہ داری سے بھی وابستہ کرتا ہے۔ قرآنِ مجید انسان کو کائنات اور اپنے گرد و پیش میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ﴾[2]

"عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہی حق ہے۔"

یہ آیت اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے کہ اسلام تحقیق، مشاہدہ، تجربہ اور فکری جستجو کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ انسان جب کائنات، فطرت اور اپنی ذات میں غور و فکر کرتا ہے تو اس کی علمی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ حقیقت تک پہنچنے کے قابل بنتا ہے۔ جدید یونیورسٹی کلچر میں بھی سائنسی تحقیق، تجرباتی علوم، سماجی مشاہدہ اور تنقیدی مطالعہ اسی اصول کی عملی صورتیں ہیں۔ تاہم اسلام اس پورے عمل کو اخلاقی ذمہ داری اور اللہ تعالیٰ کی معرفت سے وابستہ کرتا ہے تاکہ علم انسانیت کی خدمت اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنے۔

الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللَّهِ الْأَمَانِيَّ« [3]

عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور آخرت کے لیے عمل کرے، جبکہ عاجز وہ ہے جو اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا رہے اور اللہ سے بے بنیاد امیدیں وابستہ رکھے۔"

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ حقیقی فکری پختگی صرف ذہانت کا نام نہیں بلکہ خود احتسابی، دور اندیشی، صحیح فیصلہ سازی اور اخلاقی ذمہ داری کا نام بھی ہے۔ جدید یونیورسٹی ماحول میں تنقیدی فکر (Critical Thinking) اور Reflective Learning کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے، جبکہ اسلام ان تصورات کو روحانی اور اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس طرح ایک متوازن علمی شخصیت تشکیل پاتی ہے جو علم کو معاشرے کی اصلاح اور انسانیت کی خدمت کے لیے استعمال کرتی ہے۔

"سیرتِ نبوی ﷺ میں فکری نشوونما اور علمی بصیرت کی ایک نمایاں مثال صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ بظاہر اس معاہدے کی بعض شرائط مسلمانوں کے لیے سخت محسوس ہوتی تھیں، لیکن رسول اللہ ﷺ نے وقتی جذبات کے بجائے حکمت، دور اندیشی اور وسیع تر مصلحت کو ترجیح دی۔ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ یہی فیصلہ اسلامی دعوت کے فروغ، سیاسی استحکام اور مستقبل کی عظیم فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ واقعہ اس حقیقت کی روشن مثال ہے کہ مضبوط فکری تربیت انسان کو وقتی ردِ عمل کے بجائے حکمت، تحقیق اور مستقبل بینی کی بنیاد پر فیصلے کرنے کا شعور عطا کرتی ہے۔ یہی اوصاف جدید یونیورسٹی کلچر میں قیادت، پالیسی سازی، علمی تحقیق اور ادارہ جاتی ترقی کے لیے بھی ناگزیر سمجھے جاتے ہیں۔"[4]

اس تناظر میں یونیورسٹی کا فکری ماحول اگر علمی آزادی، تحقیقی دیانت، اخلاقی اقدار اور دینی رہنمائی کے امتزاج پر استوار ہو تو وہ طلبہ کے اندر متوازن شخصیت، تحقیقی بصیرت، تنقیدی فکر اور سماجی ذمہ داری کو فروغ دیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر فکری آزادی کو اخلاقی ذمہ داری سے جدا کر دیا جائے تو علم تعمیری قوت کے بجائے انتشار، مادہ پرستی اور فکری بے سمتی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے ایک مثالی یونیورسٹی کلچر وہی ہے جو علم، تحقیق،

اخلاق، روحانیت اور انسانی خدمت کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے ایسے افراد تیار کرے جو علمی اعتبار سے ممتاز، فکری اعتبار سے بالغ نظر، اخلاقی اعتبار سے باکردار اور معاشرتی اعتبار سے ذمہ دار ہوں۔ یہی متوازن فکری نشوونما جدید اسلامی تعلیمی فلسفے اور عصرِ حاضر کی اعلیٰ تعلیم دونوں کا مشترکہ نصب العین ہے۔

اسلامی علمی تصور اور علم کی حقیقت و وسعت

اسلامی علمی تصور ایک ایسا جامع، متوازن اور ہمہ گیر نظامِ فکر ہے جو علم کو محض معلومات، فنی مہارت یا پیشہ ورانہ قابلیت تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے انسانی شخصیت کی فکری، اخلاقی، روحانی اور تہذیبی تعمیر کا بنیادی وسیلہ قرار دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک علم وہ نور ہے جو انسان کو جہالت، فکری جمود، اخلاقی انحراف اور گمراہی سے نکال کر بصیرت، حکمت، شعور اور حقیقت شناسی کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ اسلام دینی اور دنیاوی علوم کے درمیان غیر ضروری تفریق پیدا نہیں کرتا بلکہ ہر اس علم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو انسانیت کی فلاح، عدل کے قیام، کائنات کی معرفت اور معاشرے کی بہتری کا ذریعہ بنے۔ یہی جامع تصور بعد میں اسلامی تہذیب میں طب، فلکیات، ریاضی، کیمیا، جغرافیہ، عمرانیات اور فلسفے جیسے علوم کی ترقی کا سبب بنا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام علم کو ایک ہمہ جہت انسانی سرمایہ تصور کرتا ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ [5]

"پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہر جماعت میں سے ایک گروہ نکلتا تاکہ وہ دین کی گہری سمجھ حاصل کرتا، پھر واپس آکر اپنی قوم کو آگاہ کرتا تاکہ وہ بچ جائیں۔"

یہ آیت اسلامی فلسفۂ علم کی ایک بنیادی جہت کو واضح کرتی ہے کہ علم کا مقصد صرف ذاتی آگہی یا انفرادی فضیلت نہیں بلکہ اجتماعی رہنمائی، فکری اصلاح اور معاشرتی ذمہ داری بھی ہے۔ یہاں "لیتفقهوا" کا لفظ محض معلومات حاصل کرنے کے معنی میں نہیں بلکہ گہری بصیرت، تحقیقی فہم، تنقیدی شعور اور حکیمانہ ادراک کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایسے علم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو تحقیق، تجزیہ، تدبر اور صحیح استنباط پر مبنی ہو۔ جدید یونیورسٹی کلچر میں بھی اعلیٰ تعلیم کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ ایسے افراد تیار کیے جائیں جو نئے علم کی تخلیق کریں، پیچیدہ مسائل کا علمی تجزیہ کریں اور معاشرے کی فکری رہنمائی کر سکیں۔ اس طرح اسلامی تصورِ علم اور جدید تحقیقی جامعات کے اعلیٰ مقاصد میں ایک بنیادی ہم آہنگی پائی جاتی ہے، البتہ اسلام اس پورے عمل کو اخلاق، تقویٰ اور اجتماعی خیر کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

نَضَّرَ اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا فَحَفِظَهُ حَتَّى يُبَلِّغَهُ غَيْرَهُ« [6]

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاداب رکھے جس نے ہم سے کوئی بات سنی، پھر اسے اچھی طرح محفوظ رکھا اور اسے دوسروں تک صحیح طور پر پہنچایا۔"

یہ حدیث اسلامی علمی روایت میں تحقیق، علمی دیانت، درست فہم اور علم کی ذمہ دارانہ اشاعت کی غیر معمولی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ علم صرف حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ اس کی حفاظت، صحیح فہم، تنقیدی جانچ اور امانت داری کے ساتھ دوسروں تک منتقل کرنا بھی ایک عظیم دینی ذمہ داری ہے۔ یہی اصول آج کی جدید جامعات میں علمی دیانت، مستند تحقیق، حوالہ نویسی اور علمی ابلاغ کی بنیاد تصور کیے جاتے ہیں۔

"سیرتِ نبوی ﷺ میں اسلامی علمی تصور کی ایک نمایاں مثال حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کرنے کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں قاضی اور معلم مقرر کرتے ہوئے دریافت فرمایا کہ وہ مسائل کا فیصلہ کس بنیاد پر کریں گے۔ حضرت معاذؓ نے عرض کیا کہ پہلے اللہ کی کتاب، پھر رسول اللہ ﷺ کی سنت، اور اگر وہاں صریح رہنمائی نہ ملے تو اجتہاد سے فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے ان کے اس جواب کو پسند فرمایا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔"[7]

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام محض تقلید کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ نصوص کے فہم، تحقیق، اجتہاد، علمی بصیرت اور ذمہ دارانہ استنباط کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہی اصول جدید یونیورسٹی کلچر میں تحقیقی فکر، تنقیدی تجزیے اور علمی خود مختاری کی بنیاد بھی تصور کیا جاتا ہے۔ اس تمام بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی علمی تصور علم کو ایک ہمہ جہت اور بامقصد حقیقت کے طور پر پیش کرتا ہے، جس میں عقل، وحی، تحقیق، اخلاق، ذمہ داری اور خدمتِ انسانیت ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ جدید یونیورسٹی کلچر اگر اس اسلامی تصورِ علم سے رہنمائی حاصل کرے تو وہ ایسے افراد تیار کر سکتا ہے جو صرف پیشہ ورانہ مہارت ہی نہیں رکھتے بلکہ فکری اعتبار سے بالغ نظر، اخلاقی اعتبار سے باکردار، تحقیقی اعتبار سے دیانت دار اور سماجی اعتبار سے ذمہ دار شہری بھی ہوں۔ یہی متوازن علمی تصور عصرِ حاضر کی جامعات کو علمی برتری کے ساتھ ساتھ اخلاقی وقار بھی عطا کر سکتا ہے۔

اسلام میں عقل، تدبر اور تفکر کا جامع تصور

اسلامی فکر میں عقل، تدبر اور تفکر انسانی شخصیت کی فکری تعمیر کے بنیادی ستون ہیں۔ اسلام نے عقل کو محض استدلال یا منطقی تجزیے کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اسے معرفتِ الٰہی، حقیقت شناسی، اخلاقی ذمہ داری اور اجتماعی اصلاح کا مؤثر وسیلہ قرار دیا ہے۔ قرآن مجید بار بار انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ کائنات، تاریخ، انسانی معاشرے

اور اپنی ذات میں غور و فکر کرے تاکہ اس کی بصیرت میں اضافہ ہو اور وہ محض ظاہری معلومات تک محدود نہ رہے بلکہ حقائق کے باطن تک رسائی حاصل کرے۔ اسی لیے اسلامی فلسفۂ علم میں عقل اور وحی کو ایک دوسرے کا معاون قرار دیا گیا ہے؛ عقل حقیقت تک رسائی کی جستجو کرتی ہے جبکہ وحی اس جستجو کو صحیح سمت، اخلاقی توازن اور مقصدیت عطا کرتی ہے۔۔ یہی وہ فکری منہج ہے جس نے اسلامی تہذیب میں تحقیق، اجتہاد، فلسفہ، سائنسی علوم اور تمدنی ارتقا کی بنیاد رکھی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ﴾ [8]

"اور اللہ اسی طرح تمہارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔"

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کا مقصد انسان کو جامد تقلید کا عادی بنانا نہیں بلکہ اسے صاحبِ فکر، صاحبِ بصیرت اور صاحبِ شعور انسان بنانا ہے۔ قرآنِ مجید انسان کو مسلسل دعوت دیتا ہے کہ وہ ہر معاملے کو تحقیق، تدبر، غور و فکر اور فکری دیانت کے ساتھ سمجھے۔ یہی اصول جدید جامعات میں تنقیدی فکر، تجزیاتی استدلال، عقلی استنباط اور شواہد پر مبنی تحقیق کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی تصورِ عقل جدید علمی تحقیق سے متصادم نہیں بلکہ اس کی اخلاقی، فکری اور انسانی جہتوں کو مزید مضبوط اور متوازن بناتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ« [9]

"دانا اور صاحبِ عقل وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور آخرت کے لیے عمل کرے۔"

یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اسلام میں عقل کا معیار محض ذہانت یا معلومات کی کثرت نہیں بلکہ خود احتسابی، حکمت، دور اندیشی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ حقیقی عقل وہ ہے جو انسان کو صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے، اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور نتائج کو پیشِ نظر رکھ کر فیصلے کرنے کی صلاحیت عطا کرے۔ یہی طرزِ فکر جدید اعلیٰ تعلیم میں Reflective Thinking اور Ethical Decision Making کی بنیاد بھی سمجھا جاتا ہے۔ "رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ حنین کے بعد نو مسلم قبائل کے سرداروں (المؤلفۃ قلوبھم) کو مالِ غنیمت میں نسبتاً زیادہ حصہ عطا فرمایا، جبکہ بعض قدیم صحابہؓ کو اس کے مقابلے میں کم ملا۔ بظاہر یہ فیصلہ بعض لوگوں کے لیے باعثِ تعجب تھا، لیکن نبی اکرم ﷺ نے اس تقسیم میں وقتی جذبات یا ظاہری مساوات کے بجائے معاشرتی استحکام، دعوتِ اسلام کی مصلحت، قبائلی نفسیات اور مستقبل کے اجتماعی مفاد کو پیشِ نظر رکھا۔"[10] آپ ﷺ کا یہ فیصلہ اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ اسلامی قیادت عقل، حکمت، تدبر اور حالات کے عمیق ادراک کی بنیاد پر فیصلے کرتی ہے۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں فکری بصیرت محض نظری مباحث تک محدود نہیں بلکہ عملی

حکمتِ عملی، سماجی نفسیات اور دور رس نتائج کے ادراک سے بھی عبارت ہے۔ یہی اصول جدید ادارہ جاتی قیادت اور پالیسی سازی میں بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

اخلاقی اقدار اور کردار سازی

اخلاقی اقدار انسانی تمدن کی اصل روح، اجتماعی زندگی کی بنیاد اور ہر مہذب معاشرے کے استحکام کا بنیادی سرچشمہ ہیں۔ کوئی بھی قوم محض سائنسی ترقی، معاشی استحکام یا تکنیکی مہارت کے بل پر دیرپا ترقی حاصل نہیں کر سکتی، جب تک اس کے افراد اعلیٰ اخلاق، احساسِ ذمہ داری، دیانت، عدل، رواداری اور حسنِ کردار سے آراستہ نہ ہوں۔ اسلام نے اخلاق کو انسانی شخصیت کا بیرونی مظہر نہیں بلکہ ایمان، نیت اور کردار کے باہمی امتزاج کا نام قرار دیا ہے۔ اسلامی تصورِ اخلاق میں انسان کا ہر قول، ہر عمل اور ہر اجتماعی رویہ اللہ تعالیٰ کی رضا، انسانی خیر خواہی اور عدل و احسان کے اصولوں سے وابستہ ہے۔ اسی لیے اسلام میں اخلاقیات کو محض سماجی آداب یا رسمی رویوں تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اسے ایک مستقل نظامِ تربیت کی حیثیت دی گئی ہے، جو انسان کی فکری، روحانی اور عملی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب میں اخلاق اور علم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں؛ ایسا علم جو کردار سازی سے محروم ہو، اسلام کی نظر میں اپنی حقیقی روح کھو دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ [11]

"درگزر کو اختیار کیجیے، نیکی کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے اعراض کیجیے۔"

یہ آیت اسلامی اخلاقی فلسفے کی نہایت جامع تصویر پیش کرتی ہے۔ اس میں عفو و درگزر، نیکی کے فروغ اور اشتعال انگیزی سے اجتناب جیسے تین ایسے بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں جو فرد کی اخلاقی تربیت اور معاشرے کے استحکام کے لیے ناگزیر ہیں۔ اسلام کا اخلاقی نظام محض برائی سے بچنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ مثبت کردار، حلم، برداشت اور اصلاحِ معاشرہ کی دعوت دیتا ہے۔ جدید جامعات میں بھی اگر طلبہ کے اندر برداشت، باہمی احترام، اختلافِ رائے کا شعور اور ذمہ دارانہ طرزِ عمل پیدا کیا جائے تو علمی ماحول زیادہ متوازن، تخلیقی اور پرامن بن سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا« [12]

"تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔"

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ اسلام میں انسان کی فضیلت کا اصل معیار اس کا کردار اور اخلاق ہے، نہ کہ اس کی دولت، حسب و نسب یا ظاہری حیثیت۔ اعلیٰ اخلاق انسان کو دوسروں کے لیے باعثِ رحمت بناتے ہیں اور اجتماعی زندگی میں اعتماد، محبت اور خیر خواہی کو فروغ دیتے ہیں۔ یہی اصول جدید تعلیمی اداروں میں کردار سازی،

پیشہ ورانہ اخلاقیات اور سماجی ذمہ داری کی بنیاد بھی ہے۔"سیرتِ نبوی ﷺ میں اخلاقی عظمت کی ایک منفرد مثال حضرت ثمامہ بن اُثالؓ کا واقعہ ہے۔ جب وہ قیدی کی حیثیت سے مدینہ لائے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ غیر معمولی حسنِ سلوک، احترام اور شفقت کا معاملہ فرمایا، حالانکہ وہ اس وقت اسلام کے سخت مخالف تھے۔ چند روز بعد آپ ﷺ نے انہیں بغیر کسی فدیے کے آزاد کر دیا۔"[13]

آپ ﷺ کے بلند اخلاق، عفو اور حسنِ معاملہ سے متاثر ہو کر ثمامہؓ نے از خود اسلام قبول کر لیا اور بعد میں اسلام کے مخلص حامی بن گئے۔ یہ واقعہ اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ اخلاقی کردار وہ قوت ہے جو دلوں کو مسخر کرتی، دشمنی کو دوستی میں بدلتی اور معاشرے میں پائیدار مثبت تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کردار کی طاقت بعض اوقات قوتِ استدلال سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔

کردار سازی کے عملی اصول اور جدید تعلیمی نظام میں اس کی اہمیت

1 اخلاصِ نیت: کردار سازی کا بنیادی اصول اور جدید یونیورسٹی کلچر میں اس کی اہمیت

اسلامی نظامِ تربیت میں کردار سازی کی بنیاد اخلاصِ نیت پر استوار ہے، کیونکہ انسان کے تمام افکار، اعمال، علمی سرگرمیوں اور سماجی رویّوں کی حقیقی قدر و قیمت اس کے باطنی مقصد اور نیت سے وابستہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اخلاص کو صرف عبادات کی بنیاد نہیں بلکہ پوری انسانی شخصیت، علمی زندگی، قیادت، تحقیق، تدریس اور معاشرتی ذمہ داری کا بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ جدید یونیورسٹی کلچر کے تناظر میں اخلاصِ نیت کی اہمیت مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔ عصر حاضر میں جامعات صرف تدریسی مراکز نہیں بلکہ تحقیق، اختراع ، علمی قیادت، سماجی خدمت اور انسانی سرمائے کی تشکیل کے مراکز ہیں۔ اسلامی تصورِ اخلاص اس بحران کا بنیادی حل پیش کرتا ہے، کیونکہ جب طالب علم، استاد اور محقق اپنی علمی سرگرمی کو اللہ تعالیٰ کی رضا، انسانی خدمت اور علمی امانت کے جذبے کے ساتھ انجام دیتے ہیں تو تحقیق میں دیانت، تدریس میں ذمہ داری اور ادارہ جاتی ماحول میں اعتماد فروغ پاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر میں اخلاص انسان کی شخصیت کو محض انفرادی سطح پر نہیں سنوارتا بلکہ پورے تعلیمی نظام کو اخلاقی استحکام عطا کرتا ہے۔ یہی فکر جدید یونیورسٹی کلچر کو ایک مثبت، متوازن اور اخلاقی علمی ماحول فراہم کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾[14]

"حالانکہ انہیں صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اسی کے لیے دین کو خالص رکھتے ہوئے۔"

یہ آیت اسلامی اخلاقی و فکری نظام میں اخلاص کی مرکزی حیثیت کو واضح کرتی ہے۔ اگرچہ آیت کا ظاہری مفہوم عبادت سے متعلق ہے، لیکن اسلامی اصول کے مطابق ہر وہ جائز اور نفع بخش عمل جو اللہ تعالیٰ کی رضا، انسانی بھلائی اور خیر کے جذبے کے ساتھ انجام دیا جائے، عبادت کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے تعلیم، تدریس، تحقیق، انتظامی ذمہ داریاں، سماجی خدمت اور علمی قیادت بھی اسی وقت حقیقی قدر حاصل کرتی ہیں جب ان کی بنیاد اخلاصِ نیت پر ہو۔ جدید یونیورسٹی کلچر میں یہ آیت اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا مقصد صرف پیشہ ورانہ مہارت پیدا کرنا نہیں بلکہ ایسے افراد تیار کرنا ہے جو علمی دیانت، اخلاقی ذمہ داری اور اجتماعی خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں۔ جب تعلیمی اداروں میں اخلاص کو بنیادی قدر کے طور پر فروغ دیا جائے تو وہاں تحقیق معیار کے لیے، تدریس تربیت کے لیے اور قیادت خدمت کے لیے انجام پاتی ہے، جس سے جامعہ کا مجموعی علمی اور اخلاقی ماحول مضبوط ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

»إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَلَا إِلَى أَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ«[15]

"بے شک اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے مال کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔"

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اصل معیار انسان کا باطن، نیت اور کردار ہے، نہ کہ اس کی ظاہری حیثیت یا دنیاوی کامیابیاں۔ ایک استاد کی عظمت صرف اس کے عہدے سے نہیں بلکہ اس کے اخلاص سے ہے، ایک محقق کی قدر صرف اس کی اشاعتوں کی تعداد سے نہیں بلکہ اس کی علمی دیانت سے ہے، اور ایک طالب علم کی کامیابی صرف ڈگری سے نہیں بلکہ اس کے کردار اور نیک مقصد سے وابستہ ہے۔ جدید یونیورسٹی کلچر میں جہاں کارکردگی، مقابلہ اور کامیابی کو اہمیت دی جاتی ہے، وہاں یہ حدیث اس توازن کو قائم کرتی ہے کہ علمی ترقی ہمیشہ اخلاقی اقدار اور خالص نیت کے ساتھ وابستہ ہونی چاہیے، ورنہ علم اپنی حقیقی افادیت کھو دیتا ہے۔ "نبی اکرم ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف قاضی، معلم اور داعی بنا کر روانہ فرمایا تو آپ ﷺ نے انہیں صرف انتظامی اختیارات نہیں دیے بلکہ سب سے پہلے ان کی فکری اور اخلاقی تربیت فرمائی۔ آپ ﷺ نے انہیں ہدایت دی کہ ہر فیصلہ کتاب اللہ، سنتِ رسول ﷺ اور حق و انصاف کی بنیاد پر کرنا، کسی ذاتی مفاد، قبائلی تعصب یا دنیاوی دباؤ کو فیصلہ سازی پر اثر انداز نہ ہونے دینا۔"[16] اس تربیت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ منصب، علم اور اختیار اس وقت تک معاشرے کے لیے مفید نہیں بن سکتے جب تک ان کی بنیاد اخلاص، امانت اور تقویٰ پر نہ ہو۔ یہی اصول آج کی جامعات میں بھی یکساں اہم ہے، جہاں استاد، محقق اور منتظم اگر اپنے منصب کو ایک امانت سمجھ کر اخلاص کے ساتھ انجام دیں تو ادارہ علمی عظمت کے ساتھ اخلاقی وقار بھی حاصل کرتا ہے۔ آج دنیا کی ممتاز جامعات علمی دیانت، تحقیقی امانت، شفافیت اور ذمہ دارانہ تحقیق کو بنیادی اقدار قرار دیتی ہیں۔ اسلامی تصورِ

اخلاص ان تمام اصولوں کو ایک اعلیٰ روحانی اور اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اگر جامعات میں اخلاص، دیانت اور خدمتِ انسانیت کو تعلیمی ثقافت کا حصہ بنایا جائے تو طلبہ محض کامیاب پیشہ ور نہیں بلکہ باکردار، ذمہ دار اور معاشرے کی اصلاح کرنے والے رہنما بن سکتے ہیں۔ اس طرح یونیورسٹی کلچر صرف علمی ترقی کا نہیں بلکہ اخلاقی و تہذیبی ارتقاء کا بھی مرکز بن جاتا ہے۔

2۔ استقامت اور اصول پسندی: کردار سازی کا مؤثر اصول اور جدید یونیورسٹی کلچر میں اس کی اہمیت

کردار سازی کے بنیادی اصولوں میں استقامت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ یہ وہ اخلاقی قوت ہے جو انسان کو وقتی مفادات، بیرونی دباؤ، معاشرتی رجحانات اور ذاتی خواہشات کے باوجود حق، عدل اور اخلاقی اصولوں پر ثابت قدم رہنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔۔ اسلامی تصورِ استقامت اس بحران کا مؤثر حل پیش کرتا ہے، کیونکہ یہ انسان کو اصولوں پر ثابت قدم رہنے، حق کی حفاظت کرنے اور ہر حال میں دیانت داری اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ جب یونیورسٹی کلچر میں استقامت کو اخلاقی قدر کے طور پر فروغ دیا جائے تو تعلیمی ادارے صرف علمی اعتبار سے نہیں بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی مضبوط ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ [17]

"بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر ثابت قدم رہے، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ ایمان کی تکمیل صرف زبانی اقرار سے نہیں بلکہ مستقل مزاجی اور عملی استقامت سے ہوتی ہے۔ اسلامی فکر میں استقامت انسان کی شخصیت کو داخلی استحکام، فکری پختگی اور اخلاقی اعتماد عطا کرتی ہے۔ جدید یونیورسٹی کلچر میں اس آیت کی عملی اہمیت یہ ہے کہ طلبہ اور اساتذہ علمی دیانت، تحقیقی صداقت اور پیشہ ورانہ ذمہ داری کو وقتی فائدے پر ترجیح دیں۔ جب ایک محقق تحقیق میں سچائی پر قائم رہتا ہے، ایک استاد تدریس میں انصاف سے کام لیتا ہے اور ایک طالب علم امتحان میں دیانت داری اختیار کرتا ہے تو یہی استقامت ادارے کی علمی ساکھ کو مضبوط بناتی ہے۔ اس طرح یونیورسٹی کا ماحول اعتماد، انصاف اور علمی وقار کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

قُلْ آمَنْتُ بِاللَّهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ [18]

"کہو: میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر ثابت قدم رہو۔"

یہ مختصر مگر جامع حدیث اسلامی کردار سازی کا بنیادی منشور ہے۔ اس میں ایمان کو صرف نظری عقیدہ نہیں بلکہ عملی استقامت کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ استقامت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر حال میں حق کا ساتھ

دے، اپنی ذمہ داری دیانت داری سے ادا کرے اور مشکلات کے باوجود اخلاقی اصولوں پر قائم رہے۔ جدید جامعات میں یہی وصف طلبہ کو علمی بددیانتی سے بچاتا ہے، اساتذہ کو انصاف پر قائم رکھتا ہے اور محققین کو علمی امانت کا پابند بناتا ہے۔ استقامت کے بغیر علمی قابلیت بھی معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے، جبکہ استقامت کے ساتھ معمولی علم بھی خیر اور اصلاح کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ غزوۂ حنین کے موقع پر جب ابتدائی مرحلے میں مسلمانوں کی صفوں میں وقتی انتشار پیدا ہوا تو بہت سے افراد پیچھے ہٹ گئے، مگر رسول اللہ ﷺ غیر معمولی استقامت کے ساتھ میدان میں ثابت قدم رہے۔ "آپ ﷺ نے فرمایا: أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ، أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ آپ ﷺ کی یہی ثابت قدمی مسلمانوں کے حوصلے کی بحالی کا سبب بنی، لشکر دوبارہ منظم ہوا اور بالآخر فتح حاصل ہوئی۔ اس واقعے سے واضح ہوتا ہے کہ حقیقی قیادت مشکل حالات میں اصولوں پر ثابت قدم رہنے کا نام ہے، نہ کہ حالات کے دباؤ کے سامنے جھک جانے کا۔"[19] جدید یونیورسٹی کلچر میں اس واقعے کی اہمیت یہ ہے کہ ایک استاد، محقق یا جامعہ کا منتظم بھی مختلف قسم کے علمی، انتظامی اور سماجی دباؤ کا سامنا کرتا ہے۔ اگر وہ اصول پسندی، انصاف اور علمی دیانت پر قائم رہے تو پورا ادارہ اس کے کردار سے متاثر ہوتا ہے۔ مضبوط ادارہ جاتی ثقافت ہمیشہ مضبوط کردار رکھنے والے افراد سے وجود میں آتی ہے، نہ کہ صرف قوانین اور ضابطوں سے۔۔ جب طلبہ علمی دیانت، اساتذہ عدل وانصاف اور منتظمین شفافیت پر ثابت قدم رہتے ہیں تو جامعہ کا ماحول تحقیق، اعتماد اور تخلیقی فکر کے فروغ کا مرکز بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس، اگر استقامت ختم ہو جائے تو علمی بددیانتی، اقربا پروری، غیر منصفانہ فیصلے اور ادارہ جاتی بحران جنم لیتے ہیں۔ لہٰذا جدید یونیورسٹی کلچر کی پائیداری کے لیے استقامت ایک ناگزیر اخلاقی اور ادارہ جاتی قدر ہے۔

3۔ محاسبۂ نفس: کردار سازی کا بنیادی اصول اور جدید یونیورسٹی کلچر میں اس کی اہمیت

محاسبۂ نفس اسلامی نظامِ تربیت کا ایک نہایت اہم اور بنیادی اصول ہے، جس کے ذریعے انسان اپنے افکار، اعمال، مقاصد، نیتوں اور عملی رویّوں کا مسلسل جائزہ لیتا ہے تاکہ اپنی کمزوریوں کی اصلاح اور خوبیوں کی نشوونما کر سکے۔ اسلامی فکر میں شخصیت کی تعمیر کا آغاز دوسروں پر تنقید سے نہیں بلکہ اپنی ذات کے احتساب سے ہوتا ہے عصر حاضر کی جامعات میں تعلیمی معیار، تحقیقی معیار، اخلاقی ذمہ داری، پیشہ ورانہ دیانت اور ادارہ جاتی احتساب کو اعلیٰ تعلیم کی بنیادی اقدار تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم جب خود احتسابی کا جذبہ کمزور ہو جائے تو تعلیمی ادارے سرقۂ علمیتحقیقی بددیانتی، غیر معیاری تحقیق، اختیارات کے ناجائز استعمال اور اخلاقی زوال جیسے مسائل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اسلامی تصورِ محاسبۂ نفس اس بحران کا بنیادی حل پیش کرتا ہے، کیونکہ یہ انسان کو

دوسروں کے احتساب سے پہلے اپنی ذات کا محاسبہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر طلبہ، اساتذہ، محققین اور انتظامیہ اپنی علمی اور اخلاقی ذمہ داریوں کا مسلسل جائزہ لیتے رہیں تو یونیورسٹی کلچر میں اعتماد، شفافیت، ذمہ داری اور اعلیٰ اخلاقی معیار فروغ پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ [20]

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل (آخرت) کے لیے کیا آگے بھیجا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تمہارے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے۔"

یہ آیت اسلامی فکر میں خود احتسابی کی جامع بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اپنے اعمال، فیصلوں اور ذمہ داریوں کا خود جائزہ لینے کی تلقین فرمائی ہے۔ اس آیت کا پیغام صرف آخرت کی تیاری تک محدود نہیں بلکہ دنیاوی زندگی میں بھی ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جدید یونیورسٹی کلچر میں یہ اصول اساتذہ کو تدریسی معیار، محققین کو تحقیقی دیانت، طلبہ کو تعلیمی ذمہ داری اور انتظامیہ کو شفاف ادارہ جاتی نظم و نسق کے حوالے سے مسلسل احتساب کی ترغیب دیتا ہے۔ جب تعلیمی اداروں میں خود احتسابی کا ماحول قائم ہو جائے تو معیارِ تعلیم بلند ہوتا ہے، تحقیق مستند بنتی ہے اور ادارے کا اخلاقی وقار مضبوط ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ، وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللَّهِ الْأَمَانِيَّ« [21]

"عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے، جبکہ عاجز وہ ہے جو اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا رہے اور اللہ سے صرف امیدیں وابستہ رکھے۔"

یہ حدیث اسلامی اخلاقی تربیت میں محاسبۂ نفس کی بنیادی حیثیت کو واضح کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے کامیاب انسان کی پہچان یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنی ذات کا احتساب کرتا ہے، اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے اور مستقبل کے نتائج کو سامنے رکھ کر فیصلے کرتا ہے۔ جدید یونیورسٹی کلچر میں یہ تعلیم اساتذہ، طلبہ اور محققین کے لیے نہایت اہم ہے، کیونکہ علمی ترقی صرف معلومات کے حصول سے نہیں بلکہ مسلسل خود احتسابی، علمی اصلاح اور پیشہ ورانہ ذمہ داری سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسا محقق جو اپنی تحقیق کا بار بار جائزہ لیتا ہے، ایک ایسا استاد جو اپنی تدریس کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ایک ایسا طالب علم جو اپنی کمزوریوں کو پہچان کر ان کی اصلاح کرتا ہے، وہی حقیقی علمی ترقی حاصل کرتا ہے۔ "غزوۂ بدر کے بعد جب قیدیوں کے بارے میں مشاورت ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کی آراء سنیں اور حضرت ابو بکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر انہیں رہا کرنے کا فیصلہ

فرمایا۔ بعد ازاں جب وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فوراً اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کو قبول کیا اور اس پر کامل عمل کیا۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قیادت اپنی رائے کو حرفِ آخر نہیں سمجھتی بلکہ حق واضح ہو جانے کے بعد اپنی رائے کا از سرِ نو جائزہ لینے اور اصلاح قبول کرنے میں عظمت محسوس کرتی ہے۔ یہی محاسبۂ نفس اور فکری دیانت کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔"[22] جدید یونیورسٹی کلچر میں اس واقعے کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک کامیاب استاد، محقق یا جامعہ کا منتظم وہ نہیں جو اپنی ہر رائے کو درست سمجھے بلکہ وہ ہے جو تنقیدی آراء کو قبول کرے، اپنی غلطیوں کی اصلاح کرے اور مسلسل بہتری کی کوشش کرے۔ یہی طرزِ فکر معیاری تحقیق، مؤثر تدریس اور مضبوط ادارہ جاتی کلچر کی بنیاد بنتا ہے اسلامی تصورِ محاسبۂ نفس ان تمام جدید تعلیمی تصورات کو ایک مضبوط اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اگر جامعات میں خود احتسابی کو انفرادی اور ادارہ جاتی ثقافت کا حصہ بنالیا جائے تو علمی معیار بلند ہوتا ہے، تحقیق میں شفافیت پیدا ہوتی ہے، تدریس مؤثر بنتی ہے اور طلبہ میں ذمہ داری، دیانت اور مسلسل سیکھنے کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔ اس طرح یونیورسٹی کلچر صرف علمی کامیابی کا نہیں بلکہ اخلاقی اور فکری ارتقاء کا بھی مرکز بن جاتا ہے۔

متعلم اور معلم کا باہمی تعلق (اسلامی تعلیمی فلسفہ)

اسلامی فلسفۂ تعلیم میں معلم اور متعلم کا تعلق محض علم کی منتقلی کا ذریعہ نہیں بلکہ شخصیت سازی، فکری ارتقاء، اخلاقی تہذیب اور روحانی تربیت کا ایک جامع اور مسلسل عمل ہے۔ اسلام تعلیم کو معلومات کے حصول سے آگے بڑھا کر انسان کی مکمل تعمیر سے جوڑتا ہے، اسی لیے معلم کو صرف مدرس نہیں بلکہ مربی، مزکی اور رہنما کی حیثیت دی گئی ہے۔ اسی طرح متعلم کو محض معلومات حاصل کرنے والا فرد نہیں بلکہ ایسا طالبِ علم قرار دیا گیا ہے جو علم کو عمل، کردار اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ جدید یونیورسٹی کلچر میں بھی استاد اور طالب علم کا تعلق اگر اعتماد، علمی دیانت، فکری رہنمائی اور اخلاقی تربیت پر استوار ہو تو جامعہ صرف علمی مرکز نہیں بلکہ باکردار قیادت تیار کرنے والا ادارہ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ [23]

"یہ اللہ کی رحمت ہی ہے کہ آپ ان کے لیے نرم خو ہیں، اور اگر آپ سخت مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔"

یہ آیت معلم اور متعلم کے تعلق کا بنیادی اصول بیان کرتی ہے کہ مؤثر تعلیم کی بنیاد سختی نہیں بلکہ شفقت، حسنِ اخلاق، حکمت اور احترام پر ہوتی ہے۔ موجودہ یونیورسٹی کلچر میں بھی استاد کی علمی قابلیت اس وقت زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے جب وہ طلبہ کے ساتھ حسنِ سلوک، اعتماد اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کرے۔ ایسا ماحول

طلبہ کے اندر تحقیق، سوال کرنے کی جرأت، فکری آزادی اور مثبت شخصیت سازی کو فروغ دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت اس حقیقت کی بہترین عملی مثال پیش کرتی ہے۔ ایک مرتبہ نوجوان صحابی حضرت عبداللہ بن عباسؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سواری پر تھے۔ آپ ﷺ نے اس موقع کو محض سفر نہ رہنے دیا بلکہ نہایت محبت اور شفقت کے ساتھ ان کی فکری و روحانی تربیت فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"اے نوجوان! میں تمہیں چند باتیں سکھاتا ہوں: اللہ کی حفاظت کرو، اللہ تمہاری حفاظت کرے گا"...

یہ مختصر مگر جامع نصیحت حضرت ابن عباسؓ کی پوری زندگی کا سرمایہ بن گئی، حتیٰ کہ وہ امت کے عظیم ترین مفسرین اور علماء میں شمار ہوئے۔ اس واقعے سے واضح ہوتا ہے کہ نبوی طریقۂ تعلیم صرف رسمی تدریس پر مبنی نہیں تھا بلکہ ہر موقع کو تربیت، رہنمائی اور شخصیت سازی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہی اسلوب جدید یونیورسٹی کلچر میں استاد اور طالب علم کے تعلق کو مؤثر اور بامقصد بنا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

»مَا كَانَ الرِّفْقُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ، وَلَا نُزِعَ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ« [24]

نرمی جس چیز میں بھی ہو اسے خوبصورت بنا دیتی ہے، اور جس چیز سے نرمی نکال دی جائے وہ بدصورت ہو جاتی ہے۔"

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ تعلیم و تربیت میں نرمی، حکمت اور حسنِ اخلاق بنیادی اصول ہیں۔ ایک کامیاب معلم وہی ہے جو طالب علم کی ذہنی استعداد، نفسیاتی کیفیت اور انفرادی ضروریات کو سمجھتے ہوئے اس کی رہنمائی کرے۔ جدید یونیورسٹیوں میں بھی تدریس کا مؤثر ترین انداز وہی ہے جس میں علمی وقار کے ساتھ انسانی تعلق، مکالمہ اور اخلاقی احترام موجود ہو۔ سیرت نگار مولانا صفی الرحمن مبارکپوری لکھتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرامؓ کی تعلیم و تربیت میں انفرادی استعداد، نفسیاتی کیفیت اور حالات کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ آپ ﷺ ہر صحابی کو اس کی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری دیتے، اس کی اصلاح کرتے اور اس کی حوصلہ افزائی فرماتے۔" [25] یہی انفرادی تربیتی اسلوب بعد میں ایسی جماعت کی تشکیل کا سبب بنا جس نے علم، کردار اور قیادت میں تاریخِ انسانیت کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے۔ یہ نبوی منہج اس بات کی رہنمائی کرتا ہے کہ جدید یونیورسٹی کلچر میں بھی معلم اور متعلم کا تعلق صرف تدریسی نہیں بلکہ فکری، اخلاقی اور شخصیتی تربیت کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ معلم کا اصل کردار صرف پڑھانا نہیں بلکہ شخصیت سازی کرنا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ معلم معاشرے کا سب سے بااثر فرد ہوتا ہے، کیونکہ وہ آنے والی نسلوں کے ذہن اور کردار کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی لیے معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود علم، اخلاق اور عمل کا عملی نمونہ ہو۔

تعلیم وتربیت میں توازن (جسمانی، ذہنی، روحانی)

اسلامی فلسفۂ تعلیم میں انسان کو محض ایک ذہنی یا مادی وجود کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت کے طور پر دیکھا جاتا ہے جس کی جسمانی، ذہنی اور روحانی صلاحیتیں باہم مربوط ہو کر اس کی حقیقی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اسی لیے اسلامی نظامِ تعلیم کا مقصد صرف علمی معلومات یا پیشہ ورانہ مہارت پیدا کرنا نہیں بلکہ ایسا متوازن انسان تشکیل دینا ہے جو جسمانی صحت، فکری بصیرت اور روحانی استقامت کے ساتھ معاشرے میں مثبت کردار ادا کر سکے۔ اگر تعلیم ان تینوں جہات میں توازن پیدا نہ کرے تو شخصیت علمی اعتبار سے تو ترقی کر سکتی ہے، مگر اخلاقی، نفسیاتی اور روحانی سطح پر عدمِ استحکام کا شکار ہو جاتی ہے، جو جدید تعلیمی بحران کی نمایاں علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ [26]

"اور جو کچھ اللہ نے تمہیں عطا کیا ہے اس کے ذریعے آخرت کا گھر حاصل کرو، اور دنیا میں اپنا حصہ بھی فراموش نہ کرو۔"

یہ آیت اسلامی تصورِ توازن کی جامع ترین بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اس میں دنیاوی ذمہ داریوں اور روحانی کامیابی کو ایک دوسرے کا مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی اصول کی روشنی میں یونیورسٹی کی تعلیم بھی اس وقت حقیقی معنوں میں کامیاب ہو گی جب وہ طلبہ کی جسمانی صحت، ذہنی ارتقاء اور روحانی واخلاقی تعمیر کو ایک متوازن تعلیمی حکمتِ عملی کے تحت فروغ دے۔ ایسا تعلیمی ماحول نوجوان کو صرف پیشہ ور ماہر نہیں بلکہ باکردار، متوازن اور ذمہ دار شہری بناتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ اس متوازن تربیت کا عملی نمونہ پیش کرتی ہے۔ "آپ ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کو اس وقت متوازن طرزِ زندگی کی تعلیم دی جب وہ مسلسل روزے رکھتے اور ساری رات عبادت میں گزار دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے جسم، آنکھوں، اہلِ خانہ اور نفس کا بھی اس پر حق ہے، لہٰذا عبادت، آرام اور معاشرتی ذمہ داریوں کے درمیان اعتدال ضروری ہے"۔ اس نبوی تربیت سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام یک رخی شخصیت نہیں بلکہ متوازن انسان کی تعمیر چاہتا ہے، جس میں عبادت، علم، صحت اور سماجی ذمہ داری سب یکجا ہوں۔ یہی اصول جدید یونیورسٹی کلچر میں بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے کہ طلبہ کو صرف تعلیمی کامیابی کے دباؤ میں مبتلا کرنے کے بجائے ان کی ذہنی صحت، جسمانی تندرستی اور روحانی استحکام کو بھی تعلیمی نظام کا حصہ بنایا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَإِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَإِنَّ لِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، فَأَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ« [27]

"بے شک تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، اور تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے، لہٰذا ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو۔"

یہ حدیث اسلامی تصورِ تعلیم و تربیت میں اعتدال اور توازن کی بنیادی اساس ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حقیقی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنی جسمانی، ذہنی، روحانی اور معاشرتی ذمہ داریوں کے درمیان متوازن طرزِ عمل اختیار کرے۔ یہی اصول جدید تعلیمی فلسفے میں بھی کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے، تاہم اسلام نے اسے چودہ صدیاں قبل ایک جامع تربیتی اصول کے طور پر پیش کر دیا تھا۔ سیرت نگار ڈاکٹر علی محمد الصلابی لکھتے ہیں کہ

"رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا امتیاز یہ تھا کہ آپ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کی شخصیت کو صرف عبادت گزار نہیں بلکہ جسمانی قوت، فکری بصیرت، اخلاقی استقامت اور سماجی ذمہ داری کے امتزاج سے آراستہ کیا۔"[28] اسی متوازن تربیت کے نتیجے میں ایسی نسل تیار ہوئی جس نے علم، قیادت، عدل اور تہذیب کے میدان میں تاریخ کا رخ بدل دیا۔ یہ نبوی منہج اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ موجودہ یونیورسٹی کلچر میں بھی تعلیم اسی وقت مؤثر ثابت ہوگی جب وہ انسان کی تمام صلاحیتوں کو متوازن انداز میں پروان چڑھائے۔ اسلامی نظامِ تعلیم اسی ہمہ گیر توازن کو اپنی بنیاد بناتا ہے، اور یہی توازن فرد اور معاشرے دونوں کی حقیقی فلاح اور پائیدار ترقی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

سماجی رویّوں اور قیادتی صلاحیتوں کی تشکیل

انسانی شخصیت کی سماجی تشکیل کا فلسفیانہ اور اسلامی پس منظر

انسانی شخصیت کی سماجی تشکیل ایک تدریجی، ہمہ جہت اور مسلسل ارتقائی عمل ہے، جو فرد کی فکری استعداد، اخلاقی اقدار، سماجی تجربات، تعلیمی ماحول اور تہذیبی ورثے کے باہمی تعامل سے تشکیل پاتا ہے۔ جدید عمرانیات شخصیت کو سماجی تعامل کا نتیجہ قرار دیتی ہے، جبکہ اسلامی فکر اس تصور کو مزید وسعت دیتے ہوئے اسے روحانی مقصد، اخلاقی جواب دہی اور اجتماعی ذمہ داری سے مربوط کرتی ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان محض ایک سماجی وجود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور ایک ذمہ دار اخلاقی شخصیت ہے، جس کی فکری پختگی، سماجی رویّے اور قیادتی صلاحیتیں اس کے ایمان، کردار اور احساسِ ذمہ داری کی عکاس ہوتی ہیں۔ اسی لیے اسلامی تعلیمات میں شخصیت سازی کا مقصد صرف انفرادی ترقی نہیں بلکہ ایسے افراد کی تشکیل ہے جو معاشرے کی اصلاح، اجتماعی فلاح اور عدل و احسان کے قیام میں مؤثر کردار ادا کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ [29]

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ ادا کرتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، اور تمام معاملات کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔"

یہ آیت اسلامی تصورِ قیادت اور سماجی شخصیت کی جامع تصویر پیش کرتی ہے۔ قرآنِ کریم کے مطابق حقیقی قیادت کا معیار اختیار، شہرت یا غلبہ نہیں بلکہ اخلاقی استقامت، دینی وابستگی، سماجی اصلاح اور اجتماعی خیر خواہی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں یونیورسٹی کلچر کا بنیادی مقصد بھی ایسی شخصیات کی تشکیل ہونا چاہیے جو علمی مہارت کے ساتھ خدمت، دیانت، عدل، سماجی ذمہ داری اور مثبت قیادت کے اوصاف سے آراستہ ہوں۔ جب نوجوان علمی ماحول میں اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا سیکھتا ہے تو اس کے اندر ایسی قیادتی صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں جو معاشرے کی مثبت تبدیلی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ« [30]

"قوم کا سردار وہ ہے جو ان کی خدمت کرنے والا ہو۔"

یہ حدیث اسلامی تصورِ قیادت کی حقیقی روح کو واضح کرتی ہے۔ اسلام قیادت کو اقتدار، برتری یا ذاتی مفاد کا ذریعہ نہیں بلکہ خدمت، امانت اور ذمہ داری کا منصب قرار دیتا ہے۔ اس اصول کے مطابق یونیورسٹی کلچر میں قائدانہ صلاحیتوں کی تربیت کا مقصد بھی ایسے نوجوان تیار کرنا ہونا چاہیے جو دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے بجائے اجتماعی خدمت، اخلاقی رہنمائی، تعاون اور عدل کو اپنی قیادت کا بنیادی وصف بنائیں۔ یہی خدمت گزار قیادت ایک صحت مند، متوازن اور ترقی یافتہ معاشرے کی بنیاد بنتی ہے۔

سماجی رویّوں کی تشکیل: داخلی شعور اور خارجی ماحول کا گہرا تعلق

سماجی رویّے انسانی شخصیت کا وہ عملی اظہار ہیں جو فرد کے داخلی شعور، اخلاقی اقدار، فکری رجحانات اور روحانی کیفیت کو معاشرتی زندگی میں منعکس کرتے ہیں۔ یہ رویّے محض وقتی جذبات یا خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مسلسل فکری، اخلاقی اور تربیتی عمل کی پیداوار ہوتے ہیں۔۔ اس کے برعکس اگر انسان کا داخلی نظام خواہشاتِ نفس، خود غرضی اور اخلاقی کمزوریوں کا شکار ہو تو بہترین تعلیمی ادارے اور ترقی یافتہ معاشرتی ماحول بھی اس کی شخصیت میں پائیدار مثبت تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ اس اعتبار سے اسلامی فکر میں سماجی رویّوں کی تشکیل

دراصل باطن کی اصلاح اور ظاہر کی تہذیب کے درمیان ایک گہرا اور ناگزیر ربط ہے، جہاں فرد کی اندرونی پاکیزگی ہی اجتماعی کردار کی مضبوطی کی بنیاد بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ [31]

"بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی داخلی کیفیت کو نہ بدل دیں۔"

یہ آیت اسلامی فلسفۂ شخصیت سازی اور سماجی اصلاح کا ایک بنیادی اور آفاقی اصول بیان کرتی ہے۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ کسی بھی معاشرے میں پائیدار تبدیلی محض بیرونی قوانین، ادارہ جاتی اصلاحات یا سماجی دباؤ سے ممکن نہیں بلکہ اس کی اصل بنیاد افراد کی فکری، اخلاقی اور روحانی اصلاح ہے۔ اسی اصول کی روشنی میں یونیورسٹی کلچر کا اصل مقصد بھی صرف علمی مہارت پیدا کرنا نہیں بلکہ ایسے نوجوان تیار کرنا ہونا چاہیے جو علمی قابلیت کے ساتھ اعلیٰ اخلاق، سماجی ذمہ داری اور مثبت طرزِ عمل کے حامل ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ[32] «

"لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔"

یہ حدیث اسلامی معاشرت کے اس بنیادی اصول کو نمایاں کرتی ہے کہ انسان کی فضیلت کا معیار اس کا نسب، منصب یا علمی شہرت نہیں بلکہ اس کی سماجی افادیت، خدمتِ خلق اور دوسروں کے لیے خیر خواہی ہے۔ چنانچہ اسلامی نقطۂ نظر میں مثبت سماجی رویّے اس وقت تشکیل پاتے ہیں جب فرد اپنی ذات سے بلند ہو کر اجتماعی مفاد، انسانی خدمت اور اخلاقی ذمہ داری کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لے۔ جدید یونیورسٹی کلچر بھی اسی وقت حقیقی معنوں میں مؤثر ثابت ہو سکتا ہے جب وہ طلبہ میں سماجی خدمت، باہمی تعاون، برداشت اور ذمہ دارانہ طرزِ عمل کو فروغ دے۔ سیرتِ نبوی ﷺ اس تصور کی عملی تفسیر پیش کرتی ہے۔ علامہ ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب السیرۃ النبویۃ میں بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں معاشرتی اصلاح کا آغاز افراد کے قلوب و اذہان کی تعمیر سے فرمایا۔ آپ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کے اندر ایمان، اخوت، ایثار، باہمی احترام اور احساسِ ذمہ داری کو اس انداز سے پروان چڑھایا کہ مختلف قبائل، زبانوں اور سماجی پس منظر رکھنے والے افراد ایک ایسے مثالی معاشرے میں ڈھل گئے جس کی بنیاد اخلاق، عدل، تعاون اور خیر خواہی پر قائم تھی"۔[33] یہ سیرتی منہج اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ پائیدار سماجی رویّے کسی مصنوعی نظم یا وقتی ضابطوں سے نہیں بلکہ مضبوط داخلی شعور، اخلاقی تربیت اور صالح قیادت کے ذریعے وجود میں آتے ہیں۔ یہی اصول عصرِ حاضر کے یونیورسٹی کلچر پر بھی منطبق ہوتا ہے، جہاں نوجوانوں کی فکری، اخلاقی اور سماجی تربیت کو یکساں اہمیت دے کر ایک ایسی نسل تیار کی جا سکتی ہے جو نہ صرف علمی اعتبار سے ممتاز ہو بلکہ سماجی رویّوں، اخلاقی کردار اور قومی ذمہ داری کے شعور میں بھی مثالی ہو۔ اسلامی

نقطۂ نظر سے سماجی رویّوں کی تشکیل میں "تزکیہ نفس" بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ تزکیہ نفس انسان کے اندرونی میلانات کو اخلاقی اصولوں کے تابع کرتا ہے، جس کے نتیجے میں فرد کا سماجی رویّہ عدل، احسان، برداشت اور خیر خواہی جیسے اوصاف کا مظہر بن جاتا ہے۔

اسلامی سماجی نظام: عدل، احسان اور اجتماعی ذمہ داری کا ہمہ گیر ڈھانچہ

اسلامی سماجی نظام محض افراد کے باہمی تعلقات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسا جامع فکری، اخلاقی اور تہذیبی نظام ہے جو عدل، احسان، امانت، باہمی تعاون اور اجتماعی جواب دہی جیسے ابدی اصولوں پر استوار ہے۔ اسلام فرد کو معاشرے سے الگ ایک خود مختار وجود کے طور پر نہیں دیکھتا بلکہ اسے ایک ایسی اجتماعی اکائی کا حصہ قرار دیتا ہے جس کی اصلاح، استحکام اور ترقی ہر فرد کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ اسی لیے اسلامی معاشرت میں حقوق و فرائض، آزادی و ذمہ داری اور فرد و جماعت کے درمیان ایک متوازن ربط قائم کیا گیا ہے، جو معاشرتی امن، باہمی اعتماد اور اجتماعی استحکام کی بنیاد بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَ إِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى﴾[34]

"بے شک اللہ انصاف، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔"

یہ آیت اسلامی سماجی نظام کے بنیادی ستونوں کو واضح کرتی ہے۔ عدل معاشرے میں حقوق کے تحفظ اور انصاف کی ضمانت فراہم کرتا ہے، جبکہ احسان معاشرتی تعلقات کو محض قانونی حدود سے بلند کر کے محبت، خیر خواہی اور ایثار کے اعلیٰ معیار تک پہنچاتا ہے۔ اسی توازن کی بدولت اسلامی معاشرہ اجتماعی ہم آہنگی اور سماجی استحکام حاصل کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ لَا يَرْحَمْهُ اللَّهُ« [35]

"جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔"

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ اسلامی سماجی نظام کی اصل روح رحمت، ہمدردی اور خیر خواہی ہے۔ ایک مسلمان کی شخصیت صرف انفرادی عبادت سے مکمل نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے سماجی رویّوں، حسنِ اخلاق اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے ذریعے بھی اپنی دینی ذمہ داری پوری کرتا ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ اس سماجی نظام کی عملی تصویر پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر راغب السرجانی اپنی کتاب "السیرۃ النبویۃ: عرض وقائع وتحلیل أحداث" میں بیان کرتے ہیں کہ "ریاستِ مدینہ کی تشکیل میں رسول اللہ ﷺ نے عدل، مواخات، اجتماعی تعاون اور باہمی ذمہ داری کو معاشرتی نظم کی اساس بنایا، جس کے نتیجے میں مختلف قبائل، طبقات اور مذاہب پر مشتمل معاشرہ ایک منظم، پُرامن اور ذمہ دار اجتماعی نظام میں تبدیل ہو گیا۔"۔[36] اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی قیادت کا مقصد صرف

حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہے جہاں ہر فرد اپنی سماجی ذمہ داری کا احساس رکھے اور عدل و احسان کو عملی زندگی کا حصہ بنائے

قیادت کا اسلامی تصور: امانت، اخلاق اور اجتماعی فلاح کا نظام

جدید یونیورسٹی کلچر میں قیادت صرف انتظامی اختیار یا تنظیمی مہارت کا نام نہیں بلکہ فکری رہنمائی، اخلاقی استحکام، اجتماعی ذمہ داری اور مثبت سماجی تبدیلی کی صلاحیت کا مظہر ہے۔ یونیورسٹی وہ ادارہ ہے جہاں نوجوان مختلف علمی، سماجی اور تنظیمی سرگرمیوں کے ذریعے قائدانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اگر یہ قیادت اخلاقی اصولوں، عدل، دیانت اور خدمتِ خلق سے وابستہ ہو تو وہ معاشرے کے لیے تعمیری قوت بن جاتی ہے، لیکن اگر اس کی بنیاد ذاتی مفادات، گروہی تعصب یا اقتدار کی خواہش پر قائم ہو تو یہی قیادت سماجی انتشار اور ادارہ جاتی کمزوری کا سبب بن سکتی ہے۔ اسی لیے اسلامی تصورِ قیادت اختیار کے بجائے امانت، جواب دہی اور اجتماعی فلاح پر مبنی ہے۔ قرآنِ مجید قیادت کے بنیادی اصول کو یوں بیان کرتا ہے:

﴿وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا﴾ [37]

"اور ہم نے انہیں ایسے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔"

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر میں حقیقی قیادت وہ ہے جو لوگوں کو خیر، عدل اور حق کی طرف رہنمائی کرے۔ یونیورسٹی کلچر میں بھی طلبہ یونینز، علمی سوسائٹیز، تحقیقی ٹیموں اور رضاکارانہ سرگرمیوں کی قیادت اسی وقت مثبت نتائج پیدا کرتی ہے جب اس کی بنیاد خدمت، دیانت اور ذمہ داری پر قائم ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَّةً، يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ، إِلَّا حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ« [38]

"جس شخص کو اللہ کسی رعیت کا ذمہ دار بنائے اور وہ ان کے ساتھ خیانت کرتے ہوئے مر جائے تو اللہ اس پر جنت حرام کر دیتا ہے۔"

یہ حدیث اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ قیادت اعزاز نہیں بلکہ جواب دہی ہے۔ یونیورسٹی کے ماحول میں بھی ہر وہ طالب علم یا منتظم جو کسی ذمہ داری پر فائز ہو، اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ذاتی مفادات کے بجائے اجتماعی مفاد، انصاف اور دیانت داری کو ترجیح دے۔ ایسی قیادت ہی ادارے میں اعتماد، نظم اور مثبت تعلیمی ثقافت کو فروغ دیتی ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ کا مطالعہ اس حقیقت کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ محمود شیت خطاب لکھتے ہیں کہ:

"رسول اللہ ﷺ نے قیادت کو اقتدار کے اظہار کے بجائے خدمت، مشاورت، عدل اور اخلاقی نمونے کے طور پر پیش کیا۔ آپ ﷺ نے ہر فرد کی صلاحیت کو پہچان کر اسے مناسب ذمہ داری سونپی، جس کے نتیجے میں صحابۂ کرامؓ کے اندر احساسِ ذمہ داری، اجتماعی نظم اور قیادتی بصیرت پیدا ہوئی۔ یہی تربیتی منہج بعد میں ایک ایسی جماعت کی تشکیل کا سبب بنا جس نے علم، اخلاق اور اجتماعی نظم کی بنیاد پر ایک مثالی تہذیب قائم کی"۔[39] اس تناظر میں یہ واضح ہوتا ہے کہ جدید یونیورسٹی کلچر میں قیادت کی حقیقی کامیابی صرف تنظیمی مہارت یا انتظامی صلاحیت میں نہیں بلکہ اخلاقی دیانت، فکری بصیرت، اجتماعی خدمت اور جواب دہی میں مضمر ہے۔ جب یونیورسٹیوں میں قیادت کا تصور اسلامی اصولِ امانت، عدل اور خدمت کے مطابق تشکیل پاتا ہے تو وہاں سے ایسے قائدین تیار ہوتے ہیں جو نہ صرف اداروں بلکہ پورے معاشرے کی مثبت فکری اور اخلاقی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ قیادت اسلامی فکر میں محض اختیار یا طاقت کا نام نہیں بلکہ ایک عظیم اخلاقی امانت ہے۔

4.3.4 دینی و روحانی پہلو اور شناخت کا بحران

عصرِ حاضر میں انسان جس فکری، تہذیبی اور اخلاقی بحران سے دوچار ہے، اس کی ایک بنیادی صورت "شناخت کا بحران" ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی اصل حقیقت، مقصدِ حیات اور وجودی حیثیت کے بارے میں واضح تصور کھو بیٹھا ہے۔ وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے کہ وہ کون ہے، اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے، اور اس کی شخصیت کی تعمیر کن اصولوں پر ہونی چاہیے۔ یہ مسئلہ صرف انفرادی سطح تک محدود نہیں بلکہ پورے تعلیمی، سماجی اور تہذیبی نظام کو متاثر کر چکا ہے۔۔ اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی اصل شناخت اس کا جسم، نسل، زبان یا سماجی حیثیت نہیں بلکہ اس کا روحانی تعلق ہے جو اسے اپنے خالق سے جوڑتا ہے۔ انسان کی حقیقت اس کی روح میں پوشیدہ ہے، اور یہی روح اسے اخلاقی، ذمہ دار اور بامقصد وجود بناتی ہے۔ روحانیت انسان کے اندر وہ باطنی شعور پیدا کرتی ہے جو اسے مادی دنیا کی محدودیت سے نکال کر اعلیٰ مقصد سے جوڑتی ہے۔ یہی شعور انسان کو یہ احساس دیتا ہے کہ وہ محض ایک حیوانی وجود نہیں بلکہ ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ [40]

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔"

یہ آیت انسانی وجود کے بنیادی مقصد کو واضح کرتی ہے۔ یہاں عبادت سے مراد صرف رسمی عبادات نہیں بلکہ مکمل اطاعتِ الٰہی ہے۔ یعنی انسان کی پوری زندگی اس کے خیالات، اخلاق، معاشرت اور فیصلے — اللہ کے

حکم کے تابع ہوں۔ اس آیت کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ انسان کی اصل شناخت اس کی بندگی میں ہے۔ جب انسان اس مقصد کو بھول جاتا ہے تو وہ اپنی اصل حقیقت سے دور ہو کر شناخت کے بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ [41]

"بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔"

یہ آیت انسان کے وجودی شعور کو بیان کرتی ہے۔ انسان نہ تو خود مختار وجود ہے اور نہ ہی بے مقصد مخلوق، بلکہ وہ اللہ کی ملکیت ہے اور اسی کی طرف لوٹنے والا ہے۔ یہ شعور انسان کو یاد دلاتا ہے کہ اس کی زندگی عارضی ہے اور اس کا اصل مقصد آخرت کی تیاری ہے۔ جب انسان اس حقیقت کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ دنیا کو اپنی آخری منزل سمجھ لیتا ہے، جس سے اس کی شناخت بکھر جاتی ہے۔ مولانا ادریس کاندھلویؒ سیرۃ المصطفیٰ ﷺ میں لکھتے ہیں کہ :"رسول اللہ ﷺ نے قیادت کی بنیاد منصب یا طاقت پر نہیں بلکہ صلاحیت، دیانت اور امانت پر رکھی۔ آپ ﷺ نوجوان صحابۂ کرامؓ کو ان کی استعداد کے مطابق مختلف ذمہ داریاں سونپتے، ان کی رہنمائی فرماتے اور عملی تربیت کے ذریعے ان میں فیصلہ سازی، مشاورت اور احساسِ ذمہ داری پیدا کرتے تھے۔[42] اس حکیمانہ طرزِ تربیت کے نتیجے میں ایسی باکردار قیادت وجود میں آئی جس نے بعد ازاں امت کی علمی، انتظامی اور سماجی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ موجودہ یونیورسٹی کلچر میں بھی طلبہ کی قیادتی صلاحیتوں کی مؤثر نشوونما اسی وقت ممکن ہے جب انہیں اعتماد، اخلاقی تربیت اور عملی ذمہ داری کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

روحانی تربیت اور شخصیت کی تشکیل

روحانی تربیت انسان کی شخصیت کا بنیادی ستون ہے۔ جب انسان کا روحانی پہلو مضبوط ہوتا ہے تو اس کے اندر تقویٰ، صبر، شکر، اخلاص اور توکل جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اوصاف اس کی شخصیت کو توازن اور استحکام عطا کرتے ہیں۔

اسلامی عبادات اسی روحانی تربیت کا عملی نظام ہیں:

- نماز انسان کو نظم اور شعور دیتی ہے
- روزہ نفس پر کنٹرول سکھاتا ہے
- زکوٰۃ سماجی ذمہ داری پیدا کرتی ہے
- حج عالمی مساوات اور وحدت کا شعور دیتا ہے

یہ تمام عبادات انسان کی شناخت کو روحانی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ [43]

"مجھے صرف اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں۔"

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد اخلاقی تکمیل ہے۔ اخلاق انسان کی اصل شناخت ہے کیونکہ اخلاقی رویّے ہی اس کی اندرونی شخصیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ جب اخلاق کمزور ہو جائیں تو انسان کی شناخت بھی غیر مستحکم ہو جاتی ہے۔ اس لیے اخلاقی تربیت شناخت کے بحران کا بنیادی حل ہے۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ [44]

"تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

یہ حدیث انسان کو فردی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر ذمہ داری کا شعور دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان صرف اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی ذمہ دار ہے۔ یہ تصور انسان کی شناخت کو وسیع کرتا ہے اور اسے صرف ذاتی وجود کے بجائے ایک سماجی اور اخلاقی وجود کے طور پر پیش کرتا ہے۔

الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ مَتَاعِهَا الصَّالِحُ [45]

"دنیا ایک فائدہ اٹھانے کی چیز ہے، اور اس کا بہترین سرمایہ نیک انسان ہے۔" ترجمہ:

یہ حدیث دنیا کی حقیقت واضح کرتی ہے کہ دنیا عارضی فائدہ ہے جبکہ اصل قدر صالح انسان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اصل شناخت اس کے اخلاق اور کردار میں ہے، نہ کہ اس کے مال یا مقام میں۔

شناخت کے بحران کے اسباب

شناخت کے بحران کے کئی بنیادی اسباب ہیں:

1. **مادیت پرستی کا غلبہ** —انسان نے روحانی اقدار کو نظر انداز کر دیا
2. **تعلیمی نظام کی کمی** —اخلاقی اور روحانی تربیت کمزور ہو گئی
3. **تہذیبی انتشار** —مختلف نظریات نے انسان کو غیر یقینی میں ڈال دیا
4. **مقصدِ حیات کا فقدان** —انسان اپنی زندگی کو بے مقصد سمجھنے لگا

یہ تمام عوامل مل کر انسان کی شناخت کو کمزور کر دیتے ہیں۔

اسلام انسان کو ایک واضح، متعین اور بامقصد شناخت فراہم کرتا ہے۔ یہ شناخت ایمان، اخلاق اور عمل پر مبنی ہے۔ قرآن انسان کو بار بار اس کے مقصدِ تخلیق کی طرف متوجہ کرتا ہے تاکہ وہ اپنی زندگی کو بے مقصدیت سے بچا سکے۔

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ [46]

ترجمہ: "بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔"

یہ آیت انسان کو اس کی اصل حقیقت یاد دلاتی ہے کہ اس کی زندگی اللہ سے شروع ہوتی ہے اور اسی کی طرف واپس جاتی ہے۔ یہی شعور انسان کو اس کی اصل شناخت عطا کرتا ہے۔

روحانیت اور سماجی توازن

روحانیت انسان کے سماجی رویّوں کو متوازن بناتی ہے۔ ایک روحانی انسان دوسروں کے ساتھ عدل، ہمدردی اور برداشت کا رویّہ اختیار کرتا ہے۔ وہ معاشرے میں مثبت کردار ادا کرتا ہے اور خود غرضی سے بچتا ہے۔ اس کے برعکس روحانی کمزوری سماجی بگاڑ، نفرت اور اخلاقی انحطاط کو جنم دیتی ہے۔ دینی و روحانی پہلو انسانی شناخت کی اصل بنیاد ہیں۔ شناخت کا بحران اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنی روحانی حقیقت سے دور ہو جاتا ہے اور اپنی زندگی کو صرف مادی یا سماجی سطح تک محدود کر لیتا ہے۔ اسلام اس بحران کا حل ایک مکمل فکری، اخلاقی اور روحانی نظام کے ذریعے پیش کرتا ہے جو انسان کو اس کی اصل شناخت، مقصدِ حیات اور اخلاقی ذمہ داری سے دوبارہ جوڑتا ہے۔ یہی نظام انسان کو ایک متوازن، باشعور اور ذمہ دار شخصیت میں تبدیل کرتا ہے جو نہ صرف اپنی ذات میں کامیاب ہوتا ہے بلکہ معاشرے کے لیے بھی ایک مثبت اور تعمیری قوت بن جاتا ہے۔ شیخ محمد الغزالی اپنی کتاب فقہ السیرۃ میں بیان کرتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے معاشرے میں قیادت کا ایسا عملی تصور پیش کیا جس میں قائد کی اصل قوت اس کا اخلاق، کردار اور لوگوں کا اعتماد تھا۔ آپ ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کی تربیت اس انداز سے فرمائی کہ وہ صرف احکام کے پابند نہ رہے بلکہ اپنی ذمہ داریوں کا شعور رکھنے والے، مشاورت کو اختیار کرنے والے اور اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینے والے افراد بن گئے۔"[47] سیرتِ نبوی ﷺ کا یہ تربیتی منہج اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ مؤثر قیادت افراد کی اخلاقی تعمیر اور اجتماعی شعور کی بیداری سے وجود میں آتی ہے، اور یہی اصول جدید یونیورسٹی کلچر میں طلبہ کی قیادتی صلاحیتوں کی تشکیل کے لیے بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ نوجوانی انسان کی زندگی کا وہ مرحلہ ہے جس میں اس کی فکری سمت، اخلاقی رویّے اور شناخت تشکیل پاتی ہے۔ اگر اس مرحلے میں نوجوانوں کو درست روحانی اور اخلاقی تربیت نہ ملے تو وہ فکری انتشار، ذہنی بے چینی اور تہذیبی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں جامعات اور تعلیمی ادارے اگرچہ علمی ترقی کے مراکز ہیں، مگر وہاں روحانی اور اخلاقی تربیت کا فقدان نوجوان نسل کے لیے ایک بڑا چیلنج بن چکا ہے۔

طلبہ تنظیمیں، ہم نصابی سرگرمیاں اور شخصیت سازی

یونیورسٹی انسانی زندگی کے اس اہم مرحلے کی نمائندگی کرتی ہے جہاں نوجوان صرف علمی معلومات حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کی فکری، اخلاقی، سماجی، نفسیاتی اور عملی شخصیت بھی تدریجی طور پر تشکیل پاتی ہے۔ یہی

وہ دور ہوتا ہے جب اس کی فکری شناخت، اقداری وابستگی، سماجی رویّے، قائدانہ صلاحیتیں اور مستقبل کا عملی وژن واضح ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یونیورسٹی محض تدریسی ادارہ نہیں بلکہ ایک ایسا جامع فکری، سماجی اور تربیتی نظام ہے جو نوجوان نسل کی شخصیت سازی میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ اگر یہ ماحول علمی سنجیدگی، اخلاقی اقدار اور مثبت اجتماعی سرگرمیوں پر استوار ہو تو یہی ادارے باکردار، باشعور اور ذمہ دار قیادت پیدا کرتے ہیں، لیکن اگر اس میں فکری انتشار، غیر ذمہ دارانہ آزادی اور اخلاقی کمزوری غالب آجائے تو نوجوان ذہنی اضطراب، شخصیت کے عدم توازن اور شناختی بحران کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اسلام بھی انسان کو محض ایک انفرادی وجود کے طور پر نہیں بلکہ ایک ذمہ دار اجتماعی شخصیت کے طور پر تیار کرتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ مجید اجتماعی اصلاح، باہمی تعاون اور منظم جدوجہد کو کامیاب معاشرے کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ [48]

"اور تم میں ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔"

یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اسلام مثبت اجتماعی تنظیموں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ایسی جماعتیں جو خیر، اصلاح، علم، اخلاق اور سماجی خدمت کو فروغ دیں، وہ معاشرے کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ یونیورسٹی کلچر میں بھی طلبہ تنظیمیں اگر علمی، اخلاقی اور تعمیری مقاصد کے لیے کام کریں تو وہ نوجوانوں میں اجتماعی شعور، خدمتِ خلق، قائدانہ صلاحیت اور ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح تنظیمی سرگرمیاں شخصیت سازی کے مؤثر ذرائع بن جاتی ہیں۔ اسی تصور کو نبی اکرم ﷺ نے بھی نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا:

يَدُ اللَّهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ [49]

"اللہ تعالیٰ کی مدد جماعت کے ساتھ ہوتی ہے۔"

یہ حدیث اجتماعی نظم، اتحاد اور تعاون کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منظم اجتماعی سرگرمیاں فرد کے اندر باہمی تعاون، نظم وضبط، مشاورت اور مشترکہ ذمہ داری کا شعور پیدا کرتی ہیں۔ یونیورسٹی کی طلبہ تنظیمیں اور ہم نصابی سرگرمیاں اگر تعمیری مقاصد اور اخلاقی اصولوں کے تحت منظم ہوں تو وہ نوجوانوں کی شخصیت میں اعتماد، تحمل، خدمت اور قیادت جیسے اوصاف پیدا کرتی ہیں، جو ایک کامیاب سماجی زندگی کے لیے ناگزیر ہیں۔ معاصر تعلیمی تحقیق بھی اس تصور کی تائید کرتی ہے۔ معروف امریکی ماہرِ تعلیم آرتھر ڈبلیو چکیرنگ (Arthur W. Chickering) اپنی مشہور تصنیف Education and Identity میں لکھتے ہیں کہ:

"طالب علم کی شخصیت کی حقیقی نشوونما صرف نصابی تدریس سے نہیں بلکہ تنظیمی سرگرمیوں، اجتماعی تجربات، قائدانہ ذمہ داریوں اور سماجی روابط کے ذریعے ہوتی ہے۔ ان کے مطابق یونیورسٹی کا ماحول طالب علم کی شناخت، خود اعتمادی، اخلاقی بلوغت اور قائدانہ صلاحیتوں کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، اس لیے ہم نصابی سرگرمیوں کو تعلیمی عمل کا لازمی حصہ سمجھا جانا چاہیے۔"[50] اس تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ طلبہ تنظیمیں اور ہم نصابی سرگرمیاں یونیورسٹی کلچر کا محض ثانوی یا تفریحی حصہ نہیں بلکہ نوجوانوں کی ہمہ جہت شخصیت سازی کا ایک مؤثر تربیتی نظام ہیں۔ تاہم ان کی افادیت اسی وقت برقرار رہتی ہے جب ان کی بنیاد علمی مقاصد، اخلاقی اقدار، نظم وضبط، باہمی احترام اور اجتماعی ذمہ داری پر ہو۔ اگر یہ سرگرمیاں تعصب، گروہی کشمکش یا ذاتی مفادات کا ذریعہ بن جائیں تو شخصیت سازی کے بجائے شخصیت کے بگاڑ کا سبب بن سکتی ہیں۔ بعض اوقات طلبہ تنظیمیں تعصب، شدت پسندی، سیاسی مفادات یا گروہی کشمکش کا شکار ہو جاتی ہیں، جس سے نوجوانوں کے اندر عدم برداشت، نفرت اور فکری انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم نصابی سرگرمیوں میں اخلاقی حدود کو نظر انداز کیا جائے تو وہ تربیت کے بجائے تفریح اور بے مقصد مشغولیت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔۔

طلبہ تنظیموں میں قیادت کی عملی تشکیل کا مرحلہ وار عمل

تحقیقی اعتبار سے قیادت کوئی موروثی یا فطری وصف نہیں بلکہ ایک تدریجی، تجرباتی اور تربیتی عمل ہے جو مسلسل عملی مشق، اجتماعی تعامل اور تنظیمی ذمہ داریوں کے ذریعے پروان چڑھتا ہے۔ جدید تعلیمی نفسیات اور اعلیٰ تعلیم کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ جامعات طلبہ کو صرف علمی مہارتیں فراہم نہیں کرتیں بلکہ انہیں ایسے عملی مواقع بھی مہیا کرتی ہیں جہاں ان کی قائدانہ صلاحیتیں، فیصلہ سازی، اجتماعی ذمہ داری اور تنظیمی شعور نشوونما پاتے ہیں۔ اسی لیے طلبہ تنظیموں کو جدید یونیورسٹی کلچر میں Leadership Incubators تصور کیا جاتا ہے، جہاں نوجوان تدریجی مراحل سے گزرتے ہوئے ایک ذمہ دار اور مؤثر قائد کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔

پہلا مرحلہ: تنظیمی ماحول سے تعارف اور ابتدائی شمولیت

قیادت کی تشکیل کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب طالب علم بطور عام رکن کسی تنظیم، علمی فورم یا ہم نصابی سرگرمی میں شامل ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں وہ تنظیمی نظم، اجتماعی اقدار، باہمی روابط، مشاورتی عمل اور ادارہ جاتی ثقافت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اگر یہ ماحول مثبت، منظم اور علمی بنیادوں پر استوار ہو تو طالب علم کے اندر احساسِ وابستگی، ذمہ داری اور اجتماعی شعور پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہی ابتدائی تجربات اس کی آئندہ قائدانہ شخصیت کی بنیاد بنتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ: عملی ذمہ داری اور تنظیمی مہارت

دوسرے مرحلے میں طالب علم کو مختلف عملی ذمہ داریاں تفویض کی جاتی ہیں، مثلاً کسی علمی سیمینار کی معاونت، رضاکارانہ خدمات، کمیٹی کی رکنیت، ٹیم ورک یا پروگرام کی تنظیم۔ یہ مرحلہ شخصیت سازی کا اہم ترین حصہ ہوتا ہے کیونکہ اسی دوران نوجوان منصوبہ بندی، وقت کی تنظیم، مؤثر ابلاغ، مسئلہ حل کرنے اور اجتماعی تعاون جیسی مہارتیں حاصل کرتا ہے۔ اس تجرباتی تربیت کے ذریعے نظری علم عملی صلاحیت میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

تیسرا مرحلہ: قائدانہ کردار اور فیصلہ سازی

تیسرے مرحلے میں طالب علم کو جزوی یا مکمل قائدانہ ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔ اب وہ منصوبہ بندی، وسائل کے استعمال، ٹیم کی نگرانی، اختلافات کے حل، مشاورت، پالیسی سازی اور اجتماعی فیصلوں کا ذمہ دار بنتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں قائدانہ اعتماد(Leadership Confidence) ، ادارہ جاتی بصیرت اور اخلاقی ذمہ داری کی حقیقی تشکیل ہوتی ہے۔ اس تجربے سے طالب علم یہ سیکھتا ہے کہ قیادت اختیار کا نام نہیں بلکہ خدمت، جواب دہی، حکمت اور اجتماعی مفاد کے لیے ذمہ داری قبول کرنے کا نام ہے۔ جدید قیادتی تحقیق اس تصور کی بھرپور تائید کرتی ہے۔ معروف ماہرین James M. Kouzes اور Barry Z. Posner اپنی عالمی شہرت یافتہ کتاب The Leadership Challenge میں لکھتے ہیں کہ:

"Effective Leadership Is Not Developed Through Classroom Instruction Alone; It Grows Through Practical Experience, Shared Responsibilities, And Continuous Opportunities For Learning. Leadership Skills Become Stronger When Students Work Together, Solve Real Problems, And Participate In Decision-Making."[51]

اسی طرح Susan R. Komives، Nance Lucas اور Timothy R. McMahon اپنی معروف تصنیف Exploring Leadership میں واضح کرتے ہیں کہ:

"Participation In Student Organizations, Volunteer Activities, And Collaborative Projects During University Helps Develop Students' Leadership Identity. Leadership Is A Gradual Process That Grows Through Practical Experience, Teamwork, Consultation, Cooperation, And Active Social Engagement[52]."

قیادت کی عملی تربیت کے نتائج

تحقیقی مطالعات سے واضح ہوتا ہے کہ طلبہ تنظیموں میں فعال کردار ادا کرنے والے نوجوانوں میں متعدد قائدانہ اور پیشہ ورانہ صلاحیتیں نمایاں طور پر فروغ پاتی ہیں، جن میں مؤثر فیصلہ سازی، تنقیدی و تجزیاتی سوچ، مؤثر ابلاغ، اجتماعی رابطہ کاری، وقت کا نظم، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت، اعتمادِ نفس اور اخلاقی ذمہ داری شامل ہیں۔ یہی اوصاف بعد ازاں انہیں پیشہ ورانہ زندگی، سماجی خدمت اور قومی قیادت میں کامیاب بناتے ہیں۔

تنظیمی ماحول اور اخلاقی تربیت

تنظیمی سرگرمیوں کی حقیقی افادیت اسی وقت سامنے آتی ہے جب ان کی بنیاد اخلاقی اصولوں، عدل، دیانت، شفافیت، برداشت اور خدمتِ خلق پر ہو۔ اگر تنظیمی ماحول میں علمی مکالمہ، باہمی احترام اور اجتماعی مفاد کو ترجیح دی جائے تو یہ نوجوانوں کی شخصیت میں فکری پختگی، اخلاقی استحکام اور قائدانہ بصیرت پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر تنظیمی سرگرمیاں گروہی تعصب، ذاتی مفادات، شدت پسندی یا غیر اخلاقی رویّوں کا شکار ہو جائیں تو یہی ماحول شخصیت سازی کے بجائے شخصیت کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔

عملی مثال

مثال کے طور پر اگر کسی یونیورسٹی میں ایک بین الاقوامی علمی کانفرنس منعقد کی جائے تو طلبہ قیادت کو موضوع کے انتخاب، علمی منصوبہ بندی، مہمان مقررین سے رابطے، بجٹ کی ترتیب، میڈیا رابطہ کاری، انتظامی تقسیم، ٹیم مینجمنٹ، وقت کی نگرانی اور پروگرام کی تکمیل جیسے متعدد عملی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تمام تجربات نوجوان کو صرف ایک منتظم نہیں بلکہ ایک ذمہ دار، منظم، بااعتماد اور دور اندیش قائد کے طور پر تیار کرتے ہیں۔ لہٰذا جدید یونیورسٹی کلچر میں طلبہ تنظیمیں محض نمائشی یا غیر نصابی سرگرمیاں نہیں بلکہ نوجوانوں کی قائدانہ، فکری اور اخلاقی شخصیت سازی کی مؤثر تجربہ گاہیں ہیں۔ جب یہ سرگرمیاں علمی بصیرت، اخلاقی اقدار اور تنظیمی نظم کے ساتھ منسلک ہوں تو یہی نوجوان مستقبل میں ایسے قائد بن کر ابھرتے ہیں جو علم، کردار، خدمت اور اجتماعی ذمہ داری کے امتزاج کی بہترین مثال ہوتے ہیں۔

تحقیقی نتائج

یونیورسٹی کلچر نوجوانوں کی فکری، اخلاقی، سماجی، روحانی اور قائدانہ شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے، لہٰذا اس کا مثبت اور متوازن ہونا ناگزیر ہے۔ 1.

2۔ اسلامی تعلیمات نوجوانوں کی ہمہ جہتی شخصیت سازی کے لیے ایک جامع اور متوازن فکری و اخلاقی نظام فراہم کرتی ہیں، جو جدید جامعات کے تربیتی اہداف سے ہم آہنگ ہے۔

3۔ قرآنِ مجید اور سنتِ نبوی ﷺ تحقیق، تدبر، تنقیدی فکر اور علمی دیانت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، جو جدید جامعات میں معیاری تحقیق کی بنیادی شرائط ہیں۔

4۔ اسلامی تعلیمات پر مبنی یونیورسٹی کلچر طلبہ میں دیانت، اخلاص، ذمہ داری، رواداری، اعتدال، سماجی خدمت اور قیادت جیسی مثبت صفات کو فروغ دیتا ہے۔

5۔ یونیورسٹی میں اساتذہ کا کردار محض علم کی منتقلی تک محدود نہیں بلکہ وہ طلبہ کی فکری، اخلاقی اور شخصیتی تربیت کے مؤثر رہنما بھی ہوتے ہیں۔

6۔ اسلامی تعلیمی فلسفہ علم، کردار اور عمل کے باہمی ربط پر زور دیتا ہے، اس لیے تعلیمی کامیابی کو اخلاقی تربیت اور کردار سازی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

7۔ تحقیقی دیانت، حوالہ نویسی، علمی امانت اور مستند علمی ذرائع کا استعمال اسلامی تحقیق اور جدید علمی معیارات دونوں کی بنیادی ضرورت ہے۔

8۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق خود احتسابی، اصول پسندی، اخلاص اور استقامت جیسی اخلاقی اقدار یونیورسٹی کلچر کو مضبوط، شفاف اور اعتماد پر مبنی بناتی ہیں۔

9۔ متوازن یونیورسٹی کلچر طلبہ میں تنقیدی و تخلیقی سوچ، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت، سماجی شعور اور قومی ذمہ داری کے احساس کو فروغ دیتا ہے، جس سے وہ معاشرے کی مثبت تعمیر میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔

10۔ یہ تحقیق اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اگر جامعات اپنے تعلیمی، تحقیقی اور ہم نصابی نظام کو اسلامی اخلاقی اقدار کے مطابق استوار کریں تو ایسی نسل تیار کی جاسکتی ہے جو علمی اعتبار سے ممتاز، اخلاقی اعتبار سے باکردار، سماجی اعتبار سے ذمہ دار اور قومی ترقی میں مؤثر کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو

حواشی

[1] UNESCO, *Reimagining Our Futures Together: A New Social Contract For Education*, Paris, 2021.

[2] القرآن:53:41

[3] محمد بن عیسیٰ الترمذی، الجامع الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع، باب منہ، حدیث:2459۔

[4] اکرم ضیاء العمری، السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، ریاض: مکتبۃ العبیکان،1994ء،2/477۔

[5] القرآن:122:9

[6] محمد بن عیسیٰ الترمذی، الجامع الترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء في الحث علی تبلیغ السماع، حدیث **2657** :۔

[7] محمد بن یوسف الصالحی الشامی، سبل الھدی والرشاد في سیرۃ خیر العباد، بیروت: دار الکتب العلمیۃ،10/120

[8] القرآن:219:2

[9] محمد بن عیسیٰ الترمذی، الجامع الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، باب25، حدیث:2459۔

[10] محمد بن یوسف القسطلانی، المواھب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ، بیروت: دار الکتب العلمیۃ،(3/411)

[11] القرآن:199:7

[12] محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب حسن الخلق، حدیث3559

[13] احمد بن محمد القسطلانی، المواھب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ، بیروت: دار الکتب العلمیۃ،(2/357)

[14] القرآن:5:98

[15] صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ، حدیث نمبر2564۔

[16] المواھب اللدنیۃ بالمنح المحمدیۃ، محمد بن یوسف القسطلاني، بیروت: دار الکتب العلمیۃ،4/184

[17] القرآن:13:46

[18] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب جامع أوصاف الإسلام، حدیث نمبر38۔

[19] الرحیق المختوم، صفي الرحمن المبارکفوري، بیروت: دار الھلال،1/432

[20] القرآن:18:59

[21] سنن الترمذي، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع، باب25، حدیث نمبر2459۔

[22] محمد الغزالی، فقہ السیرۃ، قاہرہ: دار الشروق،2005ء،1/255۔

[23] القرآن:159:3

[24] مسلم، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، حدیث:2594

[25] صفي الرحمن المباركفوري، الرحيق المختوم، دار السلام، الرياض، 1/166

[26] القرآن:77:28

[27] البخاري، صحيح البخاري، كتاب الصوم، باب حق الجسم في الصوم، حديث:1975۔

[28] علي محمد الصلابي، السيرة النبوية: عرض وقائع وتحليل أحداث، دار المعرفة، بيروت، 1/428

[29] القرآن:41:22

[30] الطبراني، المعجم الأوسط، دار الحرمين، القاهرہ، حديث:6026

[31] القرآن:11:13

[32] الإمام البخاري، الجامع الصحيح، كتاب الإيمان، باب: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ويده، حديث10

[33] محمد أبو الحسن علي الندوي، السيرة النبوية، دار القلم، دمشق، 1/287

[34] القرآن:16:90

[35] امام بخاری، محمد بن اسماعیل، الأدب المفرد، تحقيق: محمد فواد عبد الباقي، دار البشائر الإسلامية، بيروت، حديث:373

[36] راغب السرجاني، السيرة النبوية: عرض وقائع وتحليل أحداث، قاہرہ: مؤسسة اقرأ، 1/214

[37] القرآن:21:73

[38] امام بخاری، صحيح البخاري، كتاب الأحكام، باب من استرعى رعية فلم ينصح، حديث:7150۔

[39] محمود شيت خطاب، الرسول القائد، بيروت: مؤسسة الرسالة، 1/45

[40] القرآن الكريم، 51:56

[41] القرآن الكريم، 2:156

[42] ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ ﷺ، کراچی: مکتبۃ المعارف القرآن، 2/565

[43] مالک بن انس، الموطأ، بیروت، دار احیاء التراث العربی، کتاب حسن الخلق، باب ماجاء فی حسن الخلق، حدیث نمبر:1614۔

[44] محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح (صحیح البخاری)، بیروت، دار ابن کثیر، کتاب الاحکام، حدیث نمبر:7138۔

[45] مسلم بن الحجاج القشیری، الصحیح (صحیح مسلم)، کتاب الرضاع، باب خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة، حدیث نمبر:1467۔

[46] القرآن الكريم، 2:156

[47] محمد الغزالی، فقه السيرة، قاہرہ: دار الشروق، 2005ء، 1/185

[48] القرآن:104:3

[49] الإمام الترمذي، الجامع، كتاب الفتن، باب ماجاء في لزوم الجماعة، حديث:2166۔

[50] Arthur W. Chickering, Education And Identity, 2nd Ed., San Francisco: Jossey-Bass Publishers, 1993, Pp. 37–52.

[51] James M. Kouzes And Barry Z. Posner, The Leadership Challenge, 6th Ed., Hoboken, NJ: John Wiley & Sons, 2017, Pp. 19–41.

[52] Susan R. Komives, Nance Lucas And Timothy R. Mcmahon, Exploring Leadership: For College Students Who Want To Make A Difference, 3rd Ed., San Francisco: Jossey-Bass, 2013, Pp. 95–124.